دینی فرائض
کا
جامع تصور

data\Scanning\Mon
copy.jpg not
found.

پیشکش pdf format از www.hamditabligh.net

\D-data\Scanning\tanze
copy.jpg not found.

67/اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔ فون 6316638-6366638
فیکس 6271241 ای میل: markaz@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

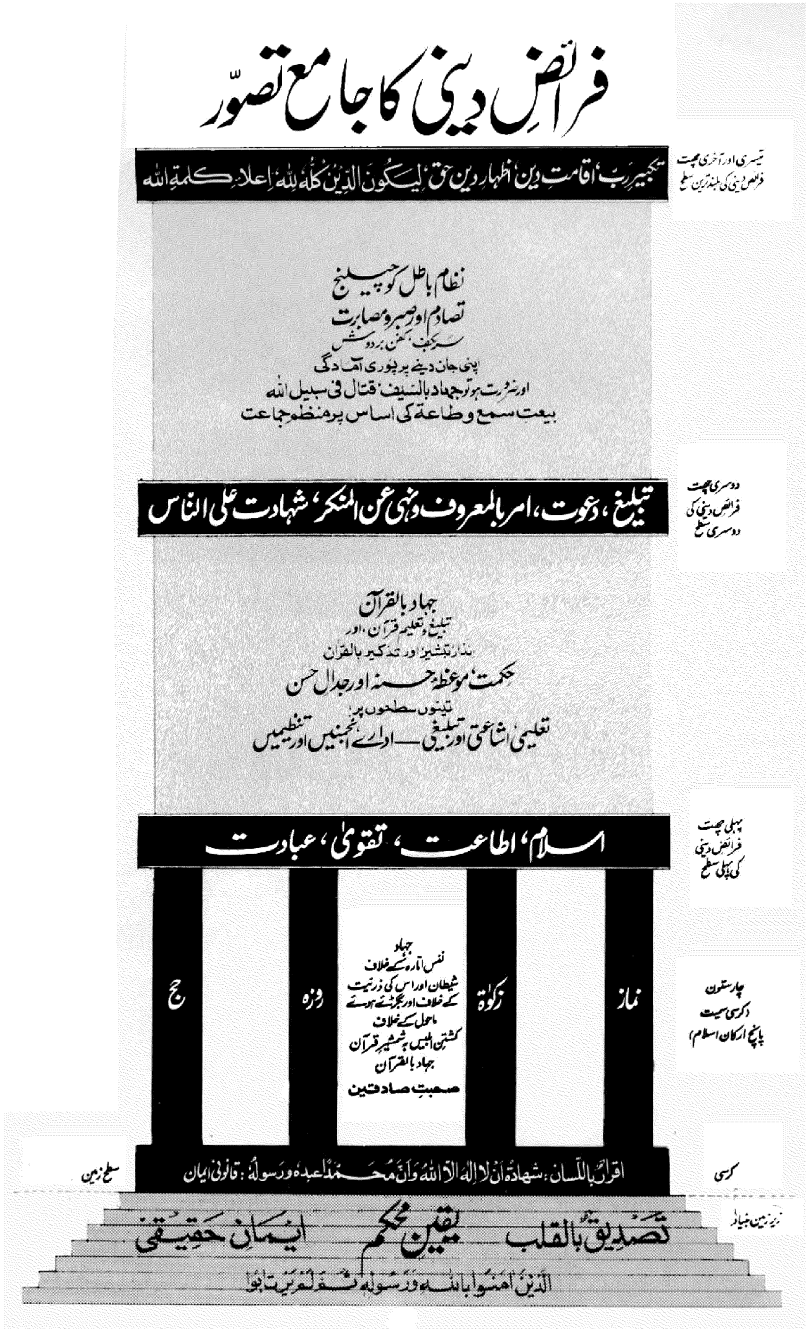

دینی فرائض کا جامع تصور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

سب سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس موضوع یعنی ''دینی فرائض کا جامع تصور'' کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے۔ دیکھئے اگر کسی شخص کو ملازم رکھا جائے اور اسے اس کی ذمہ داریاں اور فرائض معین طور پر گن کر بتا دیئے جائیں کہ مثلاً یہ دس کام یا فرائض (Duties) ہیں جو آپ کو انجام دینے ہیں تو اب اگر بالفرض وہ شخص ان میں سے چار فرائض سرے سے بھول جائے اور اسے چھ ہی یاد رہیں، تو اس کے باوجود کہ وہ شخص پورے خلوص اور امکانی حد تک محنت سے ان چھ کاموں کو انجام دینے کی سعی کرے اور اس میں کامیاب بھی ہو، لیکن جو چار فرائض اسے یاد ہی نہیں رہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ ان کو بجا نہیں لاسکتا اور کوئی عجب نہیں کہ یہی اہم ترین فرائض ہوں، اس لئے میں آج ان شاء اللہ کوشش کروں گا کہ دینی فرائض کا ایک جامع ترین تصور آپ کے سامنے پیش کروں۔

انسانی عمل کے دو محرکات

بطور تمہید میں عرض کروں گا کہ انسان کے عمل میں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں محرک کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ایک نیت اور دوسری فرائض کا صحیح شعور اور تصور۔ تو پہلی چیز ہے نیت و ارادہ ___ یعنی یہ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اس کی توحید اور شرک کے اجتناب کے ساتھ مان لیا۔ جناب حضرت محمد ﷺ پر ہمارا ایمان ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، پھر یہ کہ بعث بعد الموت اور محاسبہ اُخروی پر بھی ہمارا کامل یقین ہے تو اس ایمان و تسلیم اور ایقان و تصدیق کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا جو حکم ملے وہ سر آنکھوں پر۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ نیت اور ارادہ ہی نہ ہو تو آگے قدم اُٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ گویا اعمال انسانیہ میں ''ارادہ'' کو

بنیادی مقام حاصل ہوتا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ اسی لفظ ارادہ سے اسم فاعل ''مرید'' بنتا ہے۔ ہمارے یہاں تزکیہ نفس کا جو نظام عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے اس کا نقطہ آغاز ہی یہ لفظ ''مرید'' ہے۔ ''مرید'' سے مراد وہ فرد ہے جو اس بات کا ارادہ کرلے کہ وہ دین پر چلے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ کسی ایسے شخص سے اپنا تعلق جوڑتا ہے جس پر اسے اعتماد ہو کہ یہ شخص مخلص ہے، دوکاندار نہیں ہے۔ مزید برآں یہ اطمینان بھی ہو کہ یہ دین کو جاننے والا اور بذات خود پابند شریعت اور متقی شخص ہے اور یہ کہ اس کی صحبت میں اس کو دین پر چلنے میں تقویت حاصل ہوگی۔ ارادہ تو اس کا اپنا ہوتا ہے، لیکن اس کے لئے تقویت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ کسی متقی و دین دار عالم کو اپنا مرشد تسلیم کرکے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، یعنی بیعت کرکے یہ قول و قرار اور عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے اس مرشد کی ہدایات پر عمل پیرا ہوگا اور دین پر چلے گا۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ''مرید'' وہ شخص ہے جو دین پر کاربند ہونے کے ارادے سے کسی صاحب حال سے تعلق استوار کرے۔ اور جس سے تعلق قائم کیا جائے وہ مزکی و مربی اور مرشد کہلاتا ہے، جس کے لئے فی الوقت ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''پیر'' مروج ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے اپنی بےعملیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے جہاں دین کی بہت سی باتوں اور بہت سے کاموں کو بدنام کررکھا ہے، وہاں پیری مریدی کے سلسلے کو بھی سخت بدنام کیا ہے۔ پھر واقعہ یہ سلسلہ ہمارے معاشرے میں خالص دوکانداری اور محض رسم بن کر رہ گیا ہے۔ الا ماشاء اللہ!

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ پہلی ضروری چیز اپنا ارادہ ہے، لیکن اتنی ہی ضروری چیز یہ ہے کہ یہ صحیح تصور بھی موجود ہو کہ دین کے حقیقی فرائض کیا ہیں؟ اگر فرائض کا تصور محدود یا ناقص ہوگا تو جو چیزیں کسی کو معلوم ہیں ان پر تو وہ عمل کرلے گا لیکن جو چیزیں اسے معلوم ہی نہیں ہیں، ان پر ارادے کے باوجود وہ عمل کیسے کرسکے گا؟ چنانچہ میں آج کی اس صحبت میں اس دوسری بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے دینی فرائض کا صحیح اور جامع تصور کیا ہے، تاکہ پورے دین کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے موجود ہو اور ہم صحیح طور پر اپنا جائزہ لے سکیں کہ دین کے کتنے حصے پر ہم عمل پیرا ہیں اور کتنی چیزوں پر عمل نہیں کررہے! اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جن چیزوں پر عمل ہم نے چھوڑ رکھا ہے وہی چیزیں دینی لحاظ سے اہم ترین ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مغز سرے سے موجود ہی نہ ہو اور ہم صرف

چھلکا پکڑے بیٹھے ہوں! شاید آپ نے یہ لطیفہ سنا ہو کہ جب پہلے پہل چائے یورپ گئی تو وہاں لوگ یہ کرتے تھے کہ چائے ابال کر پانی پھینک دیتے تھے اور پتی کھاتے تھے۔ تو کہیں ہمارا حال یہ تو نہیں ہے کہ دین کی اصل ذمہ داریوں اور دین کے کے اصل فرائض سے صرف نظر ہو رہا ہو، وہ سرے سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہی نہ ہوں اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ہم دیندار ہیں اور پورے دین پر عمل پیرا ہیں! اس کا ازالہ اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ہمارے سامنے دین کا پورا خاکہ اور دینی فرائض کا جامع تصور موجود ہو۔

میرا تصور فرائض دینی

قرآن مجید اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے محدود معروضی مطالعے سے اس ضمن میں مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو فہم حاصل ہوا ہے اور جس پر میں اپنی استعداد کے مطابق اور امکان بھر عمل پیرا ہوں، میں وہی آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں، صرف اظہار واقعہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے مطالعے اور فہم میں بھی کوئی کمی، نقص اور تقصیر ہو۔ کوئی بات آج میرے علم میں نہ ہو، کل آجائے۔ جب بھی وہ علم میں آئے گی ان شاء اللہ العزیز اسے بھی بیان کردوں گا۔ لیکن آج کی تاریخ تک قرآن حکیم، سنت و سیرت نبویؐ اور سیر صحابہؓ کے مطالعے سے اور اس اُمت کی پوری تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دینی فرائض کا جو صحیح و جامع تصور میرے سامنے آیا ہے، اس کو میں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں۔

فرائض دینی اور ان کے لوازم

اس ضمن میں تین باتیں تو بنیادی و اساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔ یہ کل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی و اساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداء بھاری بھرکم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ فزکس نہیں سمجھ سکتے جب تک آپکی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات (Basid Technologies) نہ آجائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا

ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں، اس پر کاربند ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔ اب ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھ لیجئے۔

پہلا فریضہ ___ دین پر کاربند ہونا

پہلی بات کے لئے اب دینی اصطلاحات نوٹ کیجئے۔ تھوڑے سے فرق سے اس کے لئے چار اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت۔

۱) اسلام:

سب سے پہلی اصطلاح خود ''اسلام'' ہے۔ اسلام کا معنی ہے گردن نہادن۔ سرِ تسلیم خم کردینا۔ انگریزی زبان میں اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ To give up resistance اور To Surrender۔ مفہوم یہ ہوا کہ سر جھکاؤ، سرتسلیم خم کرو اور جو بھی حکم ملے اسے بلا چوں و چرا قبول کرو۔ اس رویے کا نام ہے اسلام ___ اور اس ''اسلام'' کے لئے قرآن کا تقاضا یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ: ۲۰۸)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ۔''

اس میں داخلہ جزوی طور پر نہیں ہوسکتا کہ کچھ احکام پر تو سرِ تسلیم خم ہے اور کچھ احکام پر عمل کرنے سے انکار و اعراض، سرتابی اور سرکشی! ___ اس کا نام اسلام نہیں ہے۔ یہاں تو اصول یہ ہے کہ ماننا ہے تو پورا مانو، ورنہ چھوڑو اور دفع ہوجاؤ۔ (Take it all or leave it all) یہاں بیچ بیچ کی بات نہیں چلے گی۔

۲) اطاعت:

یہ اسی طرز عمل کے لئے دوسری اصطلاح ہے۔ اب معاملہ ذرا آگے بڑھ گیا ہے۔ لفظ اسلام

میں تو مقاومت ومخالفت (Resistance) ترک کرکے خود کو حوالے (Surrender) کر دینے کا مفہوم تھا، جبکہ اطاعت کا لفظ ''طوع'' سے بنا ہے، جس کا معنی ہے دلی آمادگی۔ اردو میں ہم ''بطوع خاطر'' کے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں۔ گویا دلی آمادگی کے ساتھ فرمانبرداری قبول کرلینے کے رویے کا نام اطاعت ہے اور اس کے لئے اصول یہ ہے:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ O

(التغابن: ۱۲)

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور اگر تم روگردانی کرتے ہو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے واضح طور پر (ہدایات وتعلیمات ربانی) پہنچانے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

یہاں بھی وہی انداز ہے جو میں اسلام کے ضمن میں عرض کرچکا ہوں، یعنی یہاں بھی ''All or none Law'' کارفرما ہے۔ ہمارے نبیؐ کے ذمہ پہنچانا تھا سو انہوں نے پہنچا دیا۔ اب تم اپنا رخ کسی اور طرف کرنا چاہتے ہو، اس دعوت سے اعراض اختیار کرنا چاہتے ہو تو تم اپنی اس سرتابی و سرکشی کے خود ذمہ دار ہوگے۔ تو اسلام ''اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً'' کے تقاضے اور اطاعت کے مطالبے کے ساتھ مطلوب ہے۔ پھر یہ اطاعت بھی ہمہ تن اور ہمہ جہت درکار ہوگی۔ یہاں بھی یہ نہیں ہوگا کہ کچھ حکم مانیں گے اور کچھ حکم نہیں مانیں گے۔

۳) تقویٰ:

اس ضمن میں یہ تیسری اصطلاح ہے۔ اسلام اور اطاعت انسان کے مثبت رویے اور طرز عمل کے مظاہر ہیں۔ ان ہی کو منفی اسلوب سے بیان کیا جائے گا تو وہ ہوگا ''تقویٰ''۔ اس کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے سے بچنا، اس کی نافرمانی سے احتراز کرنا، اس کی ناراضگی کا خوف رکھنا، اس کی سزا سے ڈرنا، اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔ اس کے لئے تراجم میں ''پرہیزگاری'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور ''ڈر'' بھی، لیکن کسی اصطلاح کے ایک لفظ میں ترجمہ سے اس کا صحیح اور مکمل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے۔ اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔''

سورہ آل عمران کی اس آیت مبارکہ میں سلبی رویہ ''تقویٰ'' اور مثبت رویہ ''اسلام'' دونوں کا ذکر نہایت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔

۴) عبادت:

اس ضمن میں یہ چوتھی اصطلاح ہمہ گیر اور جامع ترین بلکہ اصل اصطلاح ہے۔ یہاں بات اور آگے بڑھی۔ دینی اعتبار سے لفظ عبادت کا اصطلاحی مفہوم ہوگا ''کسی کی محبت سے سرشار ہوکر ہمہ تن، ہمہ وجوہ اور ہمہ وقت اس کی بندگی میں اپنے آپ کو دے دینا۔'' قرآن حکیم میں انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اللہ کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الذاریات میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِO (آیت ۵۶)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

گویا انسان کو مقصدِ حیات ہی بندگی ہے، غایت تخلیق ہی بندگی ہے۔

''عبادت'' کے مفاہیم ومعانی اور مقتضیات ومقدرات پر اس سے قبل بارہا گفتگو ہوئی، آج ان سب کو جامعیت کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ عربی کے لفظ عبادت کا مفہوم فارسی کے دو الفاظ کو، جو اردو میں بھی مستعمل ہیں، جمع کرکے ادا کیا جاسکتا ہے۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش۔ بندگی میں اطاعت کا پہلو ہے اور پرستش میں محبت کا! بندہ کے معنی ہیں غلام ___ اور غلام ہمہ وقت اور ہمہ تن غلام ہوتا ہے۔ غلامی اور ملازمت میں یہی تو فرق ہے کہ ملازمت کسی معین کام کے لئے ہوتی ہے جو شخص مثلاً جھاڑو دینے پر ملازم ہے وہ جھاڑو ہی دے گا، کوئی اور کام تو نہیں کرے گا۔ اسی طرح جو باورچی کی حیثیت سے ملازم ہے وہ آپ کے گھر کا فرش تو صاف نہیں کرے گا۔ پھر ملازمت معین وقت کے لئے ہوتی ہے۔ ملازم سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ اسے چار گھنٹے کام کرنا ہے یا چھ اور آٹھ گھنٹے۔ اس کے بعد وہ آپ کا ملازم نہیں۔ لیکن غلامی یا بندگی ہمہ وقت اور ہمہ تن ہوتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت خوبصورتی سے شعر کے پیرائے میں اس

مفہوم کی ترجمانی کی ہے کہ ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

پس ذہن میں رکھئے کہ بندگی کے معنی ہیں ہمہ وقت، ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اطاعت۔لیکن محض بندگی یا غلامی ''عبادت'' نہیں ہے جب تک کہ اس میں پرستش شامل نہ ہو۔ پرستش میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ زرپرست وہ ہے جس کو مال سے انتہائی محبت ہو۔ وطن پرست، قوم پرست اور شہرت پرست جیسے الفاظ ہمارے ہاں کثرت سے مستعمل ہیں۔ پرستش اور پرستاری ہمارے جانے پہچانے الفاظ ہیں۔ ''پرستار'' ہم بولتے ہیں ''انتہائی محبت کرنے والے'' کے معنی ومفہوم میں۔ چنانچہ عبادت کا مفہوم ہوگا اللہ کی بندگی اور اس کی پرستش۔

جزوی اطاعت قابل قبول نہیں:

یہ چار اصطلاحات ہیں جن سے دین کا پہلا اور بنیادی تقاضا ہمارے سامنے آتا ہے۔لیکن اس ضمن میں اصل شے جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کو اللہ کی اطاعت کے دائرے میں لانے کا نام بندگی ہے۔ اسلام میں جزوی اطاعت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے، اس کا مطالبہ کلی اطاعت ہے__ اس ضمن میں ایک آیت میں آپ کو سنا چکا ہوں یعنی ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً'' ایک دوسری آیت اور سن لیجئے جس سے یہ بات مزید واضح ہوجاتی ہے۔ اگرچہ اس میں خطاب یہود سے ہے، لیکن یہ بات جان لیجئے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوئی۔ یہود کو قرآن نے اُمت مسلمہ کے لئے نشانِ عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر اُمت مسلمہ بھی یہ روش اختیار کرتی ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں یہود کے حوالے سے کیا گیا ہے تو پھر ان کے لئے بھی وہی سزا ہوگی جس کے مستحق یہود قرار دیئے گئے تھے۔فرمایا:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ط فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَO (البقرہ :۸۵)

''کیا تم (ہماری) کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ پس تم میں

سے جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں اسے ذلیل و خوار کردیا جائے اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

یہ وعید اس لئے ہے کہ یہ جو طرزِ عمل ہے کہ کچھ باتوں کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا تو اس کے ڈانڈے درحقیقت منافقت سے جڑ جاتے ہیں۔ یہ دوعملی ہے، دورنگی ہے، یہ دورخا کردار ہے، جبکہ اللہ کو یک رنگی درکار ہے۔ ''صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً'' پس دورنگی منافقت ہے اور منافقت وہ روگ ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے صراحت کی ہے کہ

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا O

(النساء : ۱۴۵)

''منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے اور وہ اپنے لئے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔''

جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے تھوڑا بہت شغف ہے، وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب کافروں پر اتنا نہیں بھڑکتا جتنا منافقوں پر بھڑکتا ہے۔سورۃ الصّف میں ہم نے ان دو آیات کا مطالعہ بھی کیا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَO کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَO(آیات ۲،۳)

''اے اہل ایمان! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ یہ بات اللہ کے نزدیک سخت بیزاری پیدا کرنے والی ہے کہ تم جو کہو اس کو کرو نہیں!''

ہم اپنے آپ کو کہتے ہیں مسلم__ اور مسلم کا معنی ہے تابع فرمان۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کو اُٹھا کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، بندے کا معنی ہے غلام۔اس حیثیت سے ہمیں اللہ کے تمام احکام ماننے چاہئیں، اس پر عمل کرنا چاہئے۔جس کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے، اسے ترک کرنا چاہئے اور جن چیزوں کو واجب اور فرض کیا ہے ان کو ادا کرنا چاہئے۔ اگر ہم اللہ کے ان احکام کو جو ہمیں پسند نہ ہوں، پس پشت ڈال دیں تو ہم پر یہ بات بالکل صادق آئے گی کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ!!

ارکانِ اسلام اور ان کی اہمیت:

ہماری اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دین کے تقاضوں میں سے پہلا تقاضا اسلام پر کار بند ہونا اور عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے لئے اصطلاحات چار ہیں: (۱) اسلام (۲) اطاعت (۳) تقویٰ (۴) عبادت۔ ان میں جامع ترین اصطلاح عبادت ہے، جس کا مفہوم ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ جہت بندگی اور پرستش ہے، یعنی محبت کے جذبے سے سرشار ہوکر کلی اطاعت! __ اب میں چاہوں گا کہ ضمیمہ (Appendix) کی حیثیت سے اس کے ساتھ یہ بات جوڑ لیجئے کہ یہ کام آسان نہیں ہے، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لئے تو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم

کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

یعنی میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ''لاالٰہ الا اللہ'' کہنے سے کیا لازم آتا ہے! جو اس کی حقیقت سے واقف نہیں انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن جن کو اس کلمے کے تقاضوں اور مطالبوں کا علم ہے وہ تو واقعتاً یہ کلمہ زبان سے ادا کرتے ہوئے کانپ اُٹھتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ کرم فرمایا کہ اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے چار عبادات عطا فرمادیں، جنہیں ارکانِ اسلام بھی کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّی اللہ علیه وسلّم بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھادَۃِ اَن لاَاِلٰہَ اِلاّ اللّٰہُ وَاَنّ محمّدًا عبدُہٗ و رَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصّٰلوۃِ وَاِیْتاء الزَّکٰوۃِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ، وَصَوْمِ رَمَضان (متفق علیه)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

ہر شخص شہادتین کی ادائیگی سے اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ یہ گویا بنیاد ہے فاؤنڈیشن ہے۔ عملی ستون چار ہیں: نماز، زکوٰۃ، حج بیت اللہ اور رمضان کے روزے۔ ان ہی کو ہم ''عبادات'' کہہ

دیتے ہیں، اگرچہ پورے قرآن مجید میں ان کے لئے لفظ ''عبادت'' کہیں نہیں آیا۔ عبادت کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جس کی تشریح میں نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہمہ وقت، ہمہ تن، ہمہ جہت، اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر اس کی بندگی اور پرستش کرے۔ لیکن یہ ''عبادات'' اس فریضہ عبادت رب کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اس کی مدومعاون ہوتی ہیں۔ چنانچہ نماز کا نظام اس لئے عطا ہوا کہ دن میں پانچ مرتبہ اپنی مصروفیات سے نکلو اور اللہ کے روبرو کھڑے ہوکر اپنے قول وقرار ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' کی تجدید کرو اور اپنے ایمان کو تازہ رکھو لہٰذا فرمایا گیا ''اَقِمِ الصَّلوٰۃَ لِذِکْرِیْ'' کہ نماز قائم کرو میری یاد کے لئے! کہیں مصروفیات میں گم ہوکر اپنے رب کو نہ بھول جاؤ۔ زکوٰۃ کی عبادت اس لئے مرحمت فرمائی ہے کہ مال کی محبت کو دل سے کھرچا جاسکے، جو بڑی تباہ کن شے ہے اور سوامراض کا ایک مرض ہے۔ روزہ اس لئے فرض ہوا کہ ''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ''۔ نفس کا گھوڑا بڑا منہ زور ہے، اس کو لگام دینے اور قابو میں رکھنے کی روزوں کے ذریعے تربیت حاصل ہوجائے اور اس کے بے محابا تقاضوں سے بچا جاسکے اور حج کے اندر یہ تمام برکات جمع کردی گئیں۔ اس میں ذکر بھی ہے، طواف بھی ہے۔ اس میں احرام کی پابندیاں بھی ہیں جو روزے سے مشابہ ہیں۔ اس میں پیسے کا خرچ بھی ہے جو زکوٰۃ کے مشابہ ہے، تو یہ چار ارکان اسلام یا چار عبادات اس لئے فرض کی گئیں تاکہ اسلام کی چھت ان ارکان یعنی ستونوں پر استوار ہوجائے۔ یہ ارکان اسلام عبادتِ کلی کے لئے سہارے اور Support کا کام انجام دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ تسہیل فرمائی اور ہمارے لئے یہ آسانی فراہم فرمائی ہے۔ یہاں پہلی بات سے متعلق گفتگو ختم ہوئی۔ اب آیئے دوسری بات کی طرف۔

دوسرا فریضہ __ دین کو دوسروں تک پہنچانا

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارا دوسرا فرض اور ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسلام کو پھیلائیں۔ پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ ہم اس پر خود عمل پیرا ہوں، اس پر کاربند ہوں۔ لیکن دوسرا فرض اور دوسری ذمہ داری اسلام کو پھیلانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس ذمہ داری کے لئے بھی کئی اصطلاحات ہیں، لیکن چار کو ضرور ذہن نشین کرلیں۔

(i) تبلیغ

دوسروں تک پہنچائیں گے تو اسلام پھیلے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا۔

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (المائدہ : ۶۷)

''اے رسولؐ پہنچا دو جو کچھ نازل ہوا ہے آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دے دیا ''**بَلِّغُوْا عنّی ولَوْ ایۃً** پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت'' حجۃ الوداع میں آپؐ نے یہ فرما کر تبلیغ کی ذمہ داری تا قیام قیامت اُمت کے سپرد فرما دی کہ'' **فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھدالغائبَ**، اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں۔''

(ii) دعوت

یعنی لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَاالِی اللہِ وَعَمِلَ صَالِحًا (حم السجدہ :۳۳)

اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو۔'' اور

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ والْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۵)

''پکارو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان ''کج بحثوں'' سے مجادلہ کرو اس طور پر جو بہت عمدہ ہو۔

(iii) امر بالمعروف ونہی عن المنکر

یہ اصطلاح بڑی اہم ہے۔ امر بالمعروف کا مطلب ہے نیکی کا پرچار، نیکی کی تلقین کا حکم اور نہی عن المنکر سے مراد ہے بدی سے، بُرائی سے لوگوں کو روکنا، بدی اور بُرائی کی اشاعت کے آڑے آنا اور اگر قوت و طاقت میسر ہو تو بدی اور بُرائی کو بزور طاقت روکنا۔ اس کے لئے حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرہُ بِیدِہٖ فَاِن لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلسانِہٖ فَاِن لَمْ یَسْتَطِعْ

فَبِقَلبِہٖ و ذٰلِک اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (رواہ مسلم، عن ابی سعید الخدریؓ)

''تم میں سے جو کوئی بھی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) بدلے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (یعنی تلقین و نصیحت سے اس بُرائی کو روکے)۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

یعنی کم از کم دل میں کڑھن تو ہو۔ اگر یہ کڑھن بھی نہ ہو تو اس کیفیت کے لئے دوسری حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حبّۃُ خردلٍ

''اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں۔''

یعنی تم بدی کو دیکھو، منکر کو دیکھو، اور تمہارے احساسات پر جوں بھی نہ رینگنے پائے۔ بُرائی کو دیکھتے ہوئے گزر جاؤ لیکن یہ صدمہ بھی نہ ہو کہ یہ کیوں ہو رہا ہے، کیوں میرے ہاتھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس کو روک سکوں۔ اگر یہ کیفیت ہے تو جان لو کہ ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی دل میں موجود نہیں اور یہ فتویٰ کس کا ہے؟ یہ حقیقی مفتی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے۔ ان کا فتویٰ کون رد کرے گا اور اگر رد کرے گا تو کیا ایمان سلامت رہ جائے گا۔

(iv) شہادت علی الناس

یہ چوتھی اصطلاح جامع ترین ہے۔ شہادت علی الناس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر حجت قائم کر دینا تا کہ قیامت کے دن عدالت خداوندی میں گواہی دے سکو اور Testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین پہنچا دیا تھا۔ یہ وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر تبلیغ و دعوت کا تعلق کارِ رسالت سے جا کر جڑ جائے گا___ رسول کیوں بھیجے گئے! اس کو سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ سے سمجھئے جہاں فرمایا:

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَامِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰؤُلَآءِ شَھِیْدًاO

''اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور اے نبیؐ آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف۔''

کیوں؟ اس لئے کہ رسول یہ گواہی دیں گے کہ اے رب! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب

اپنے اعمال و افعال کے یہ لوگ خود ذمہ دار ہیں ــــ اب بتائیے کہ یہ گواہی ہمارے حق میں جائے گی یا خلاف؟ یہ گواہی خلاف جارہی ہے۔عدالتِ خداوندی میں رسول دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام بے کم و کاست ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ اب ان کی ذمہ داری تھی کہ یہ تیرا پیغام بنی نوع انسان تک پہنچا کر ان پر حجت قائم کریں۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا کہ ہم نے جو تمہیں اُمتِ وسط یعنی بہترین اُمت بنایا ہے تو یہ اسی فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لئے ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (بہترین اُمت) بنایا، تاکہ تم گواہ ہوجاؤ پوری نوع انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہوجائیں تم پر۔''

عبادت رب کے بعد شہادت علی الناس کی یہ دوسری اہم ذمہ داری ہے جو اُمت کے سپرد کی گئی۔اس کی نزاکت کو جان لیجئے۔ اگر رسول بالفرض اللہ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے ہاں وہ مسئول اور ذمہ دار ہوتے! انہوں نے پہنچا دیا لہٰذا وہ بَری ہوگئے اور باقی دنیا کو پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے حوالے کرکے تشریف لے گئے۔ اس لئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے،صرف عرب کے لئے تو نہیں۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا) اور قُلْ يٰاَيُّهَاالنَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف) اور وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء) ــــ باقی دنیا کو کون پہنچائے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کرچکا کہ حجۃ الوداع میں آں حضورؐ نے فرمادیا کہ اب یہ کام تمہارے ذمے ہے۔ فَلْيُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الغائبَ کہ میں نے پہنچایا تمہیں، اب تم پہنچاؤ ان کو جو یہاں نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات مزید سمجھ لیجئے کہ یہ صرف اُس وقت کی دنیا والوں کا معاملہ نہیں تھا۔ اب تو دائمی رسالتِ محمدی کا دور ہے۔ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اب تا قیامت بنی نوع انسان کے لئے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کون ادا کرے گا؟ یہ ذمہ داری اُمت محمد کی ہے (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ اگر اُمت یہ فریضہ ادا نہیں کرتی تو جان لیجئے کہ دنیا کی گمراہی کا وبال اُس کے سر آئے گا۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کا اُمتی ہونے سے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کریڈٹ مل جائے گا!

میں آپ کو دوسرا رخ دکھا رہا ہوں۔ یہ تو اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر آپ اسے ادا نہیں کرتے تو دنیا کی ضلالت اور گمراہی کا وبال بھی آپ کے ذمہ آئے گا۔ بنی نوع انسان عدالت اُخروی میں یہ عذر پیش کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ اے اللہ، ان کے پاس تیری آخری اور مکمل کتاب تھی، ان کے پاس تیرا دین تھا، یہ تیری شریعت کے علمبردار تھے، یہ تیرے آخری نبی اور رسول کے اُمتی تھے، انہوں نے اس دین کو نہ ہم تک پہنچایا اور نہ خود اس پر عمل کیا۔ یہ تیری آخری کتاب اور آخری نبی کی تعلیمات پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔

میں آپ کی نصح و خیر خواہی کا حق ادا نہیں کر پاؤں گا اگر میں آپ کو متنبہ نہ کردوں کہ اگر آپ کا طرز عمل یہ ہوگا تو آخرت میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خدارا مجھے بتائیے کہ اللہ رب العزت کی عدالت میں جب ہم سے یہ سوال ہوگا کہ تم ہمارے آخری نبی و رسول جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی تھے، تمہارے پاس ہمارا دین تھا، تم حاملِ قرآن تھے، ہم نے چینیوں اور امریکیوں کو اپنا دین نہیں دیا تھا، بلکہ اس کا وارث تم کو بنایا تھا اور یہ تمہاری ذمہ داری لگائی تھی کہ ان تک ہمارا دین پہنچاؤ۔ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو روسیوں میں مبعوث نہیں کیا تھا، ان تک پہنچانا تمہارے ذمے تھا، تو ہمارے پاس کیا جواب ہوگا؟ دوسروں تک دین نہ پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہوگی یا نہیں؟ تو یہ ہے دوسری ذمہ داری جسے میں نے چار اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دوسروں تک تو کیا پہنچائیں گے، آج ہم خود محتاج ہیں کہ صحیح دین ہم تک پہنچے۔ ہم تو الا ماشاء اللہ پیدائشی طور پر (By Birth) اور نام لے کر مسلمان ہیں کہ علامہ اقبال کے بقول:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو!
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

تیسرا فریضہ ــــ دین کو قائم کرنا

اب آیئے تیسری ذمہ داری کی طرف۔ یعنی یہ کہ دین کو قائم کیا جائے۔ ایک ہے تبلیغ و دعوت، یعنی دین کو پھیلانا، اسے دوسروں تک پہنچانا، اس کی طرف لوگوں کو بلانا ــــ اور ایک ہے اسے قائم و غالب کرنا۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اسلام اگر ایک مکمل نظام حیات ہے، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ (اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) تو اسے بالفعل قائم کیا جانا چاہئے۔ ہم یہ بات بڑے فخر سے

کہا کرتے ہیں کہ ہمارا دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ آج پاکستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جو یہ بات نہ جانتا ہو اور نہ کہتا ہو۔ یہ فکر بڑا عام ہے۔ کم از کم ہمارے دروس وخطابات کے سامعین اور ہمارے لٹریچر کے قارئین میں سے تو کوئی شخص ایسا نہیں ہوسکتا جو اس بات کو جانتا نہ ہو۔ تو اگر یہ دین ایک مکمل نظام حیات ہے تو اس کو قائم کیوں نہیں کرتے! یہ صرف تبلیغ وتلقین کی خاطر، یا محض تحقیقی مقالے لکھنے اور چھاپنے کی غرض سے، یا مدح سرائی کرنے اور قصیدے کہنے کے لئے تو نہیں ہے۔ نظام اگر بالفعل قائم ہو تو اسے نظام کہا جائے گا، ورنہ وہ نظام ہے ہی نہیں۔ پھر تو وہ محض ایک Utopia یعنی ایک خیالی دنیا ہے یا ایک ایسا نظریہ جس کا عمل کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو!

اس تیسری ذمہ داری کے لئے قرآن حکیم میں ہمیں چار اصطلاحات ملتی ہیں، جن میں سے دو مکی سورتوں میں وارد ہوئی ہیں اور دو مدنی سورتوں میں۔

(۱) تکبیر رب

یہ اصطلاح مکی سورتوں میں سے سورۃ المدثر میں آئی ہے، جہاں فرمایا گیا: وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ''اور اپنے رب کو بڑا کرو!'' آپ شاید حیران ہوں کہ میں نے یہ کیا ترجمہ کیا ہے!...... تو جان لیجئے کہ تکبیر کا لفظی معنی ہے کسی شے کو بڑا کرنا۔ تصغیر کا معنی ہے کسی شے کو چھوٹا کرنا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب کو بڑا کرنا چہ معنی دارد؟ وہ تو بذاتہٖ بڑا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا والے اس کی بڑائی کو عملاً تسلیم نہیں کر رہے۔ چنانچہ تکبیر رب سے مراد ہے اس کی بڑائی کو منوانا، اسے تسلیم کرانا اور تشریعی معاملات میں اسی کے حکم کی تنفیذ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا گیا اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور بقول علامہ اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

غور کیجئے کہ اس لحاظ سے تو وہ کہیں بڑا نظر نہیں آتا! بڑے تو ہم بنے بیٹھے ہیں۔ کیا آج ہمارا طرز عمل یہی نہیں ہے کہ حکم تو بس ہمارا چلے گا، ہم نہیں جانتے کہ کون اللہ ہے، کون نہیں! بتایئے! آج پوری دنیا کا یہ رویہ ہے کہ نہیں؟ ہم اذانوں میں کہہ دیتے ہیں ''اللہ اکبر''، جلسوں اور جلوسوں میں ''نعرہ تکبیر'' کے جواب میں فلک شگاف انداز میں کہہ دیتے ہیں ''اللہ اکبر'' ...... لیکن کہنے کو جتنا

چاہیں کہہ لیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے، حقیقت میں اللہ کہاں بڑا ہے؟ اس کی بڑائی اور اس کی کبریائی نظام حیات میں تو بالفعل کہیں بھی نافذ نہیں۔ حالانکہ ''تکبیر رب'' کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ (Absolute Sovereignty) کو تسلیم کیا جائے، مانا جائے کہ آخری اختیار اس کا ہے اور آخری فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نظام قائم کرو گے تو تکبیر رب کا تقاضا پورا ہوگا۔

دیکھئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی پہلا حکم ملا ''اِقۡرَا'' پہلی وحی میں تبلیغ اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ''اقرا'' دو مرتبہ آیا۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ O خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ O اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ O الَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ O عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَالَمۡ یَعۡلَمۡ O (العلق ۱ تا ۵)

دوسری وحی سورۃ المدثر ہے۔ وہاں باقاعدہ خطاب سے بات شروع ہوئی ''یٰۤاَیُّھَا الۡمُدَّثِّرُ'' ''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے'' ! خطاب کے بعد پہلا حکم ملا ''قُمۡ فَاَنۡذِرۡ'' ''کھڑے ہو جاؤ'' کمر بستہ ہو جاؤ، مستعد ہو کر اپنا فرض منصبی ادا کرو! دو کام کرو۔ انذار اور تکبیر رب! بنی نوع انسان کو خبردار اور آگاہ کرو، نیند کے ماتوں کو جگاؤ کہ کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو، زندگی صرف یہ زندگی نہیں ہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آئے گی۔ ''وَمَا ھٰذِہِ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا لَھۡوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَالۡاٰخِرَۃَ لَھِیَ الۡحَیَوَانُ ط لَوۡکَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ''(العنکبوت) کہ اے لوگوں! اچھی طرح جان لو، یہ دنیا کی زندگی عارضی زندگی ہے اور بس ایک کھیل اور دل کا بہلاوا، اور اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا گھر ہے، کاش لوگوں کو سمجھ آ جائے اور یہ کہ قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن سب کو اپنے رب کے حضور میں جواب دہی کے لئے لازماً کھڑے ہونا ہوگا۔ ''اَلاَ یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ O لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ O یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ O'' ''کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن (یعنی قیامت کے روز) اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جب پوری نوع انسانی اس کائنات کے مالک کے سامنے (جواب دہی کے لئے) کھڑی ہوگی۔'' یہ انسان اس زعم میں مبتلا نہ رہے کہ یہ محض ڈراوا ہے۔ یہ دن آ کر رہے گا اور یہی اصل ہار جیت کا دن ہوگا۔ ''یَوۡمَ یَجۡمَعُکُمۡ لِیَوۡمِ الۡجَمۡعِ ذٰلِکَ یَوۡمُ التَّغَابُنِ'' ...... یہ انذار ہے اور یہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کا نقطہ آغاز ہے۔ لیکن جانا کدھر ہے، آخری منزل کون سی ہے؟ اس کا

تعین اگلی آیت میں کر دیا گیا: ''وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ'' یعنی وہ منزل ہے تکبیر رب! اور آپ غور کیجئے، تیئیس سال میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر رب فرما دی کہ نہیں!...... یہ ماننا پڑتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں آپؐ نے وہ نظام قائم فرما دیا جس میں اختیارِ اعلیٰ (Supreme Authority) اور حاکمیتِ مطلقہ کا مالک فقط اللہ عزوجل ہی کو تسلیم کیا گیا تھا۔

خیال رہے کہ تکبیر رب کی ذمہ داری آنحضورؐ کو مرتبہ رسالت پر مامور ہونے کے وقت ہی سونپ دی گئی تھی۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے اور مجھے بھی اس سے اتفاق ہے کہ پہلی وحی یعنی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے آنحضورؐ کی نبوت کا اور دوسری وحی یعنی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا آغاز ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

(۲) اقامت دین

اسی ذمہ داری کے لئے دوسری اصطلاح اقامتِ دین ہے جو ایک دوسری مکی سورت سورۃ الشوریٰ میں وارد ہوئی۔ فرمایا گیا۔

اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ

''دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقے میں نہ پڑو۔''

قائم کون سی چیز کو کہتے ہیں؟ اس کو جو کھڑی ہو۔ زمین پر پڑی ہوئی چیز تو قائم نہیں کہلاتی۔ کوئی چیز گر جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو قائم کرو، اسے کھڑا کرو۔ دین اگر پہلے سے قائم ہے تو اسے قائم رکھنا اہل دین کو ذمہ داری ہوگی اور اگر زمین بوس ہو تو اس کا اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا ہے کہ اسے قائم کریں، اسے کھڑا کریں۔ اسی دین کے مطابق نظامِ معیشت و معاشرت استوار ہو، اسی کے مطابق نظامِ حکومت و سیاست قائم ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو ''اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کا تقاضا پورا ہو رہا ہے اور اگر نہیں تو جان لیجئے کہ محض تلاوت اور مدح سرائی کے لئے تو یہ دین نہیں اُتارا گیا......

دیکھئے سورۃ المائدہ میں فرمایا۔

قُلْ یٰاَهْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (آیت ۶۸)

''(اے نبی صاف صاف) کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔''

یہاں وہی لفظ اقامت (قائم کرنا) ہے۔ اب اس آیت میں بغرض تفہیم ''یَا اَهْلَ الْکِتَاب'' کی جگہ ''یا اَهلَ الْقراٰن'' اور ''تورات و انجیل'' کی جگہ ''قرآن'' رکھ دیجئے تو بات یوں ہوگی: ''یٰااَهْلَ الْقراٰن لَسْتُمْ عَلٰی شیءٍ حتّٰی تقیموا القراٰنَ'' کہ اے اہل قرآن، اے حاملان کتاب اللہ! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو۔ قرآن حکیم اگر واقعی ضابطہ حیات ہے، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، تو اس کو نافذ کیا جانا چاہئے۔ قرآن نے اگر کوئی نظام دیا ہے، اور واقعی دیا ہے، تو وہ نظام قائم ہونا چاہئے۔ یہ مختصر شرح ہوئی ''اقامت دین'' کی جو مکی دور کی دوسری اصطلاح ہے۔

(۳) یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰه

یہ تیسری اصطلاح مدنی دور کی ہے اور یہ دو سورتوں (سورۃ البقرہ اور الانفال) میں آئی ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَاتَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ (آیت ۱۹۳)

''اور جنگ کرو ان (مشرکین) سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے!''

یہ نہ ہو کہ دین کو اجزاء میں تقسیم کر لیا جائے...... مسجد میں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہوں، روزے بھی بڑے اہتمام سے رکھے جا رہے ہوں، چلئے زکوٰۃ بھی جیسے تیسے ادا کی جا رہی ہو، حج اور عمرے بھی ذوق وشوق سے ہو رہے ہوں...... لیکن ملک میں قائم نظام حکومت کے ڈھانچے میں دین کو کوئی دخل نہ ہو! مالی معاملات کو ہم شریعت کے تحت لانے کے لئے کسی طور پر تیار نہ ہوں اور اس سے گریز کے لئے عذرات کا انبار لگا دیں، حدود و تعزیراتِ اسلامی کے نفاذ کا فیصلہ اگر کر بھی لیں تو اس پر عمل درآمد کے لئے عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو۔ ستر وحجاب کے احکام کے بارے میں ہماری سوچ یہ ہو کہ یہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے، لہٰذا ان کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس معاملے میں

دین کے احکام کی پوری ڈھٹائی سے خلاف ورزی میں ہمارے قدم آگے بڑھتے چلے جائیں اور مرد وزن کی مساوات اور زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں دونوں کو شانہ بشانہ مواقع فراہم کرنا ہمارا نعرہ (Slogan) بن جائے۔ عورت کے تقدس کو ہم برسرِ بازار نیلام کریں اور اسے اشتہار وتشہیر کی جنس بنا کر رکھ دیں۔ ہمارا حال تو اتنا پتلا ہے کہ صدر ایوب کے دور میں جو عائلی قوانین بذریعہ آرڈی نینس جاری ہوئے تھے اور جن کی اکثر دفعات کو پاکستان میں موجود تمام فرقوں کے علماء نے متفقہ طور پر خلاف اسلام قرار دیا تھا، ان کو قانونی طور پر شریعت کورٹ میں زیرِ بحث نہیں لایا جاسکتا۔ اس لئے کہ معلوم ہے کہ شریعت کورٹ خلاف شریعت دفعات کو گوارا نہیں کرے گی اور اس طرح مغرب زدہ اور اباحیت پسند خواتین وحضرات کے ایک چھوٹے لیکن بااثر طبقے کی ناراضگی کا اندیشہ ہے اور اس طبقے کو مطمئن رکھنا ضروری ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہمیں اس مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے کا ہے، اس کا مطلب یہی تو ہے کہ ہم نے دین کے حصے بخرے کر دیئے ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ ''شریعت کورٹ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا لیکن طے کر دیا گیا کہ فلاں فلاں اُمور اس کورٹ کے دائرے سے باہر ہیں، حتیٰ کہ عائلی قوانین بھی اس کی حدود کار میں نہیں آتے۔ حالانکہ عائلی قوانین وہ ہیں، جن پر قرآن حکیم نے سب سے زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ بحث ایک دو نہیں، متعدد سورتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے یہ عائلی قوانین وہ تھے جن کو انگریز تک نے نہیں چھیڑا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انگریز نے ہمارے Personal Law کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کے بعد اسلام کے عائلی قوانین کی کتر بیونت کی گئی۔ ایک مارشل لاء آیا تو یہ مسخ شدہ غیر اسلامی قوانین نافذ ہوئے اور دوسرا مارشل لاء آیا تو اس نے ان کو تحفظ دیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو کام غیروں نے ہمارے دورِ غلامی میں نہیں کیا، وہ اپنوں نے آزادی ملنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے کیا۔

تو تیسری اصطلاح ہمارے سامنے سورۃ البقرہ اور سورۃ الانفال کی دو آیات کے حوالے سے یہ سامنے آئی کہ دین کل کا کل اللہ کے لئے ہو۔ جیسا کہ میں نے عبادت کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ عبادت وہی ہوگی جو پوری زندگی پر محیط ہو، اسی طرح ''اقامتِ دین'' کے بارے میں نوٹ کر لیجئے کہ یہ اقامت پورے اور مکمل دین کی ہوگی۔ یہ نہیں کہ ایک حصہ ہمیں پسند نہیں، وہ مشکل ہے، لہٰذا وہ قائم نہ کریں، اور جو حصہ ہمیں پسند ہے اور آسان ہے وہ قائم کر دیں۔ تو یہ اللہ اور اس کے رسول

کی اطاعت نہ ہوئی بلکہ یہ تو اپنے من کی چاہت ہے جس کی پیروی کی جارہی ہے!

(۴) غلبۂ دینِ حق

اس سلسلے کی چوتھی اور عظیم ترین اصطلاح وہ ہے جو سورۃ الصّف میں وارد ہوئی اور جو سورۃ الصّف کی مرکزی آیت کا اصل موضوع ہے۔ فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (آیت ۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ غالب کر دے اس کو تمام جنس دین (یا تمام نظام ہائے اطاعت) پر۔

یہ الفاظ ایک شوشے کے فرق کے بغیر سورۃ الصّف کے علاوہ سورۃ التوبہ میں اور سورۃ الفتح میں بھی آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں آخری ٹکڑا آیا: **وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ** اور سورۃ الفتح میں **وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا** ، اس طرح ان تین مقامات کے حوالے سے ''**اظهارُ دینِ الحقِّ علی الدّین کُلِّهٖ**'' کی یہ اصطلاح سامنے آئی۔

آپ نے دیکھا کہ اصطلاحات ثقیل ہوتی چلی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اصل بات کو سادہ ترین الفاظ میں آپ کے سامنے رکھا۔ ان کا پھر اعادہ کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ دین پر خود عمل پیرا ہو اور کاربند ہو۔ دوسری یہ کہ دین کو پھیلاؤ اور تیسری بات یہ کہ دین کو قائم کرو۔ یہ ہیں تین فرائض جو ہم پر دین کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کلمہ شہادت ان کے لئے بمنزلہ بنیاد کے ہے، اور نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ اس کے چار ستون ہیں۔ ان چار ستونوں پر یہ تین منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ اہم ترین دینی اصطلاحات کے حوالے سے ان تین منزلوں کو (۱) عبادتِ رب (۲) شہادت علی الناس اور (۳) اقامتِ دین کا نام دیا جائے گا۔ اگر آپ کے ذہن میں دینی فرائض کا یہ تصور موجود ہے تو بنیادی خاکہ مکمل ہوگیا، اور اگر یہ نہیں ہے اور ذہن میں صرف نماز، حج اور روزہ ہی ہیں تو پھر ستون ہی ستون ہیں، چھت تو آپ کے سامنے ہے ہی نہیں۔ بغیر چھت کے جو ستون ہوتے ہیں وہ تو بطورِ یادگار کھڑے رہ جاتے ہیں، ان کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ آثارِ قدیمہ ہوسکتے ہیں، اور تو کوئی مقصد پورا نہیں کرتے۔ چنانچہ فرائض دینی کی عمارت کا خاکہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ارکان اسلام یعنی کلمۂ شہادت، نماز، زکوٰۃ، حج اور روزہ پر اسلام، اطاعت اور

عبادتِ رب کی پہلی منزل استوار ہوتی ہے۔تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس اس کی دوسری منزل ہے، جبکہ تکبیرِ رب، اقامتِ دین، کل کا کل دین اللہ ہی کے لئے ہو اور اظہارِ دین الحق یعنی اس دینِ حق کو غالب و قائم کردیا جائے، یہ تیسری منزل ہے۔ یہ خاکہ اپنے ذہن میں رکھئے تو آپ کے سامنے صحیح تصور آئے گا کہ ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہمارے دینی فرائض کیا ہیں؟ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندۂ مومن سے مطالبات کیا ہیں؟

فرائض دینی کے تین لوازم

پہلا لازمہ ___ جہاد

اب آیئے ان تین اُمور کی طرف جن کی حیثیت ان فرائض کے لوازم یعنی لازمی تقاضوں کی ہے۔ان میں سے پہلے لازمی تقاضے کو سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہوگا کوشش اور کشاکش۔ غور کیجئے کہ کوشش اور محنت کئے بغیر کیا یہ منزلیں سر ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ محض کوشش اور محنت سے بھی کام نہیں بنتا، اس لئے کہ پہلے خلاء تو ہے نہیں، آپ اگر اپنے نظریات کے مطابق کوشش کررہے ہیں تو اور لوگ بھی تو ہیں جو اپنے نظریات کے لئے کوشش کررہے ہیں۔ لہٰذا کوشش، کوشش سے ٹکرائے گی۔ جب کوشش باہم ٹکراتی ہیں تو اس کا نام ہوتا ہے کشاکش، جسے عام طور پر کشمکش بھی کہا جاتا ہے۔اس کشاکش یا کشمکش کے لئے دینی اصطلاح ''جہاد'' ہے۔ یہ جہاد وہ پہلا لازمی عمل ہے کہ اگر یہ ہوگا تو دین کے وہ تین بنیادی تقاضے پورے ہوں گے جو ہمارے سامنے آئے، ورنہ نہیں۔اب اس لفظِ جہاد کو ان تین بنیادی تقاضوں کے حوالے سے بھی سمجھ لیجئے۔

(۱) جہاد مع النفس

فرائض دینی کی پہلی سطح یعنی اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی سطح پر جہاد کس سے ہوگا؟ اپنے نفس سے___اپنے نفس کو اللہ کا مطیع بنانے کے لئے کشاکش کرنی ہوگی، کیونکہ نفس تو کسی اور طرف زور لگاتا رہتا ہے، ازروئے الفاظِ قرآنی: ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ '' وہ حرام کی طرف بڑھنا چاہتا ہے، آپ کو اسے روکنا ہوگا۔ اس کے اندر خواہشات کا سرکش گھوڑا ہے، آپ کو اسے

لگام دینی ہوگی۔ صبح ہوگئی ہے، اذان سن لی ہے، اللہ کی پکار آ گئی ہے، نفس کہتا ہے کہ سوتے رہو۔ اس سے کشمکش کریں گے اور اسے زیر کریں گے تو نماز کے لئے کھڑے ہوسکیں گے، ورنہ نہیں۔ اگر اس وقت ذرا سی کروٹ لی اور چادر اوپر سرکالی کہ ابھی اٹھتے ہیں تو پھر اٹھنا محال ہے۔ یہی کشمکش و کشاکش دراصل جہاد کی پہلی اور اہم ترین سطح ہے۔حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المُجاھدمن جاھدنفسَہٗ'' (رواہ الترمذی) ایک مرتبہ نبی اکرمؐ سے سوال کیا گیا: ''ایُّ الجھادِ افضل یا رسولَ اللہ؟'' اے اللہ کے رسول بہترین جہاد کون سا ہے؟ آنحضورؐ نے فرمایا ''اَن تُجاھِد نفسَک فی طاعتِہِ اللہ'' یہ کہ تو اپنے نفس کو اللہ کا مطیع بنانے کے لئے اس سے جہاد کرے۔!'' ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جَاھِدُوا اَھواءَ کُم کَما تُجاھِدُوْنَ اعداءَ کُم'' ''اپنی خواہشاتِ نفس سے بھی اسی طرح جہاد کیا کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔'' ایک موقع پر آنحضرتؐ نے روزمرہ کے معمولات کو اللہ کے احکام کے تابع رکھنے کو ''جہاد اکبر'' قرار دیا، اور یہ موقع سفرِ تبوک سے واپسی کا تھا جس سے زیادہ طویل اور سخت سفر شدید گرمی کے موسم میں کوئی اور نہیں ہوا تھا۔ اس سفر سے مدینہ منورہ مراجعت ہورہی تھی تو اس موقع پر فرمایا: ''رَجعتُمْ مِنَ الْجِھَادِ الْاَصغرِ اِلَی الجِھاد الْاَکْبر '' یعنی لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اعداء سے مقابلہ اور کشاکش ہی جہاد ہے، بلکہ یہ جو ہمارے اندر بیٹھا ہوا دشمن ''ہمارا نفس'' ہے اہم ترین کشاکش اس سے کرنی پڑتی ہے۔اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کی پہلی سطح اور اس کا پہلا مرحلہ ''جہاد مع النفس'' ہے۔یعنی اپنے نفس کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی!

(۲) جہاد بالقرآن

دینی فرائض کے دوسرے مرحلے یعنی تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس

ل ابلیس کو ہلاک کرنا ایک مشکل کام ہے، اس لئے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں کے اندر روپوش ہوجاتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ تم اسے مسلمان کرلو (اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ) تم شمشیرِ قرآنی کے ذریعے اسے گھائل کرو!

کی سطح پر جہاد کی صورت کیا ہوگی؟ دیکھئے! آپ اگر دین کی تبلیغ کر رہے ہیں، اس کی دعوت دے رہے ہیں تو الحاد، دہریت، مادہ پرستی، فسطائیت، اشتراکیت اور دوسرے ادیان و مذاہب باطلہ کے مبلغین بھی تو آپ کے اسی معاشرے میں موجود ہیں۔ آپ اسلام کے قائل ہیں تو کفر کی طاقتیں بھی یہیں موجود ہیں۔ دعوت وتبلیغ کی سطح پر ان سے کشمکش وکشاکش ہوگی۔ البتہ یہ کشاکش نظریاتی سطح پر ہوگی، خیالات کی سطح پر، فلسفہ وفکر کی سطح پر___ اس کشاکش میں مال اور جسم و جان کی توانائیاں کھپانی پڑیں گی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب توحید کی دعوت دے رہے تھے تو آپؐ کے مقابل ابوجہل اور اس کے ساتھی شرک اور بت پرستی کے علمبردار بن کر کھڑے تھے۔ چنانچہ باہم کشاکش ہوئی کہ نہیں؟ پس تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس کے فرائض کی ادائیگی کے لئے جب آپ محنت، کوشش اور جدوجہد کریں گے تو اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی کفر اور الحاد میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے تو یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آپ کو کشمکش وکشاکش سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ اب یہ مرحلہ مشکل تر ہوگیا۔ پہلے تو اپنے باطن میں کشاکش والا معاملہ تھا، جہاد مع النفس تھا، اب دعوت وتبلیغ کے لئے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے اور شہادت علی الناس کے لئے آپ کو جہاد کرنا ہوگا، کشمکش کرنی پڑے گی، باطل کے ساتھ، الحاد کے ساتھ، اباحیت کے ساتھ اور تمام باطل نظریات کے ساتھ۔ اس جہاد اور کشاکش میں تلوار کونسی چلے گی؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں رہنمائی فرمائی ''وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا'' (آیت۵۲) کہ اے نبی! ان کفار سے جہاد کیجئے اس قرآن کے ساتھ، زبردست جہاد، یہاں ''بہ'' کی ضمیر مجرور قرآن کی طرف جارہی ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے تمہارے ہاتھ میں قرآن دیا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ قرآن بھی ایک تلوار ہے۔ علامہ اقبال نے اس کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نفس اور شیطان کے ساتھ کشمکش کرنے کے لئے یہی قرآن کی تلوار کام دے گی۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی؎

چنانچہ نفس امارہ کو بھی مارو گے تو قرآن کی تلوار سے مارو گے، ویسے یہ نہیں مرے گا۔ اور شیطان سے لڑنے کے لئے بھی یہی تلوار کام آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھ میں قرآن مجید کی صورت میں دی ہے اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے، جسے ہم نے ''کتابِ مقدس'' بنا کر طاقوں میں رکھ چھوڑا ہے۔ تو یہ جہاد کی دوسری سطح ہوئی۔ یعنی فکری ونظریاتی سطح پر کشاکش اور تصادم۔ حق کا بول بالا کرنا، یعنی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے جان و مال سے سعی و جہد کرنا۔ اس کے لئے زبان بھی استعمال ہوگی اور قلم بھی۔ اس میں تمام ذرائع ابلاغ اور نشرواشاعت کے تمام وسائل استعمال ہوں گے اور ان سب کے ذریعے قرآن مجید کی دعوت اور اس کے پیغام کو پھیلایا جائے گا۔

(۳) قتال فی سبیل اللہ

تیسری سطح یعنی اللہ کے دین کو بالفعل قائم و نافذ کرنے کے مرحلے پر یہ جہاد بھی اپنی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور یہ جہاد کا تیسرا اور بلند ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں باطل کے علمبرداروں کے ساتھ کشاکش اور تصادم ہوگا۔ دعوت وتبلیغ کے مرحلے میں کشاکش اور تصادم باطل نظریات کے ساتھ تھا۔ لیکن جب دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آئے گا تو یہ کشاکش اور تصادم محض باطل نظریات سے نہیں بلکہ باطل کے علمبرداروں اور باطل کی قوتوں کے ساتھ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اس راستے میں مزاحم ہوں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ ٹھیک ہے ہم ہٹ جاتے ہیں، آپ آیئے اور اپنا دین قائم و نافذ کردیجئے! ایں خیال است ومحال است وجنوں___ ہر نظامِ باطل کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات (Privileged Classes) کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے طبقات کے ہاتھوں میں ملک کے معاملات کی زمامِ کار ہوتی ہے۔ تو کیا ایسے تمام طبقات کبھی یہ گوارا کریں گے کہ آپ وہ رائج نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں، ہٹا کر دین کا نظام مکمل طور پر قائم کردیں؟ اس بات کو وہ لوگ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان کے ساتھ لازماً پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی۔ اس پنجہ آزمائی کی بھی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح Passive Resistance یعنی صبر ومصابرت اور استقامت کی ہے۔ دوسری سطح Active Resistance یعنی اقدام کی ہے، جبکہ تیسری سطح Armed Conflict یعنی مسلح تصادم کی ہے۔ اہل حق اگر کمزور ہوں تو جب تک طاقت حاصل نہ ہو

جائے انہیں صبرِ محض کی روش پر عمل کرنا ہوگا۔ وہ مار کھائیں گے لیکن ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے، کیونکہ حکمت اسی میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں اسی حکمت پر عمل ہوا۔ وہاں اہلِ ایمان کو یہی حکم تھا کہ مصائب جھیلو، ظلم و تعدی برداشت کرو، لیکن ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ یہ ہے صبر و مصابرت، یعنی Passive Resistance لیکن جب طاقت حاصل ہو جائے تو پھر انہیں اجازت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ چنانچہ وہی مسلمان جو مکہ میں ہاتھ نہیں اُٹھا رہے تھے، مدینہ میں ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ انہیں اذنِ قتال دے دیا گیا:

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّھُمۡ ظُلِمُوۡا ط وَاِنَّ عَلٰی نَصۡرِھِمۡ لَقَدِیۡرُۨO (الحج: ۳۹)

’’اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف (کفار کی طرف سے) جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔‘‘

تو جان لیجئے کہ اس کشمکش کا آخری مرحلہ مسلح تصادم (Armed Conflict) ہے، یعنی قتال فی سبیل اللہ۔ اور یہ جہاد کی چوٹی ہے۔ سورۃ الصّف میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہی چوٹی محبوبیت رب کا مقام ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌO (آیت ۴)

’’بلاشبہ اللہ کو تو اپنے وہ بندے محبوب ہیں جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس طرح صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔‘‘

اس موقع پر میں صحیح مسلم کی ایک حدیث شریف کا حوالہ دے رہا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنۡ مَاتَ وَلَم یَغۡزُ، وَلَمۡ یُحَدِّث بِہ نفسَہٗ مَاتَ علٰی شعبۃٍ من النّفاق

’’جو شخص اس حال میں مرگیا کہ نہ اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔‘‘

چنانچہ دل میں یہ تمنا ضرور رکھنی چاہئے۔ اگر دل میں فی الواقع ایمان موجود ہے تو یہ آرزو ضرور رہے کہ کوئی وقت آئے کہ خالصتاً اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے ہم اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹا کر سرخرو ہو جائیں۔ اگر اس تمنا سے سینہ خالی ہے تو اس سینے میں نفاق ہے۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے۔

دوسرا لازمہ ___ التزام جماعت

فرائضِ دینی کے ضمن میں دوسرا لازمی تقاضا التزامِ جماعت ہے۔ کون ہے جو بقائمی ہوش و حواس یہ کہہ سکے کہ یہ کام انفرادی طور پر ہو سکتے ہیں؟ کوئی ایک بھی سلیم العقل شخص ایسا نہیں ہوسکتا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ ان کاموں کے لئے جماعت ضروری نہیں۔ اگر یہ اُمور یعنی عبادتِ رب، شہادت علی الناس، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ، فرائض دینی ہیں تو ان کے لوازم کا شمار بھی فرائض میں ہوگا، کیونکہ جو شے فرض کی ادائیگی کے لئے لازمی ہو وہ بھی فرض ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے لئے وضو شرط ہے تو وضو بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لئے احرام شرط ہے تو احرام بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ لہٰذا التزامِ جماعت بھی لازم و واجب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، جسے حضرت حارث الاشعریؓ نے روایت کیا ہے:

اٰمُرُکُمۡ بِخمسٍ بِالجماعۃ والسمع، والطاعہ، والھجرۃ، والجھادا فی سبیل اللّٰہ(رواہ احمد والترمذی)

’’میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزام جماعت کا، (امیر کا حکم) سننے اور ماننے کا، ہجرت کا، اور اللہ کے راستے میں جہاد کا!‘‘

ہجرت کیا ہے؟ یہ کہ ہر اس چیز کو چھوڑ دینا جو اللہ کو پسند نہ ہو ___ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: **ای الھجرۃ افضل یا رسول اللّٰہ؟** تو آپؐ نے جواب دیا: **ان تھجر ما کرہ رَبُّک** (رواہ النسائی، عن عبداللہؓ بن عمرو) ___ یہاں تک کہ وقت آئے اور گھر بار اور وطن چھوڑ نا پڑے تو اس کے لئے بھی انسان ہر دم آمادہ رہے اور یہ ہجرت کی چوٹی ہے۔ جیسے جہاد کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے اس طرح ہجرت کی چوٹی اللہ کے دین کے لئے ترکِ وطن ہے۔ رہا جہاد فی سبیل اللہ تو اس کا آغاز مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال ہے اور سب سے پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا وہ التزام جماعت ہے۔ یہ ہے التزام جماعت کی فرضیت۔

اب یہ آپ حضرات کے سوچنے کی بات ہے کہ آپ کسی ایسی جماعت میں شامل ہیں یا نہیں جو اقامت دین کے لئے، دین کو قائم کرنے کے لئے، دین کو برپا کرنے کے لئے اور دین کو شہادت علی الناس کی سطح پر دنیا میں پھیلانے کے لئے قائم کی گئی ہو۔ باقی اگر آپ نے رفاہِ عامہ، خدمتِ خلق، اشاعت تعلیم یا اپنے پیشہ وارانہ مفادات کے تحفظات کے لئے کوئی انجمن، کوئی ادارہ یا کوئی ایسوسی ایشن بنائی ہوئی ہو تو اس پر ''جماعت'' کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس حدیث کی رو سے تو وہ جماعت درکار ہے جس کا مقصدِ وجود اللہ کے دین کا غلبہ ہو۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے

اور ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

اور یہ بات بھی جان لیجئے کہ اس جماعت کا نظام ٹھیٹھ اسلامی اصول ''سمع و طاعت'' پر ہونا چاہئے، جس کا حکم بھی مذکورہ بالا حدیث میں ''بالسمع والطاعۃ'' کے الفاظ میں آیا ہے۔ اگر ایسی کسی جماعت میں شامل نہیں ہیں تو دین کے یہ تقاضے گویا آپ کے سامنے ہی نہیں ہیں۔

تیسرا لازمہ ـــ بیعت

دینی فرائض کے لوازم میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کا جو نظام قائم ہو وہ بیعت پر مبنی ہو، یہ وہ واحد نظام ہے جو ہمیں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے سے ملتا ہے۔ کتاب وسنت میں مجھے اس کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں ملا اور نہ کوئی مجھے آج تک بتا سکا۔ اب یہ بات سمجھئے کہ یہ بیعت ہے کیا! ایک شخص سے ان فرائض کی ادائیگی کے ارادے سے شخصی تعلق قائم کرنا، اس کے ہاتھ پر ان فرائض کی انجام دہی کے لئے قول وقرار کرنا بیعت ہے۔ میں نے شروع ہی میں لفظ ''مرید'' کی وضاحت کردی تھی کہ مرید وہ ہے جو ارادہ کرلے۔ یعنی ایسا فرد جو اپنی اصلاح کے ارادے سے کسی کے ہاتھ پر قول وقرار کے لئے بیعت کرلے۔ چنانچہ شخصی اصلاح اور تزکیہ نفس کے لئے بیعت کی جاتی ہے۔ اور یہ بیعت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کے تقاضوں اور

مطالبوں پر پورا اترنے کے لئے کسی مرد صالح کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ یہ بیعت ''بیعت توبہ'' یا ''بیعت ارشاد و تزکیہ'' کہلاتی ہے اور جب اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت، دین کی نشر واشاعت، شہادت علی الناس اور اقامت دین جیسے عظیم فرائض کی ادائیگی اور اس کے لئے سمع و طاعت پر مبنی جماعت کے قیام اور ہجرت و جہاد کا مرحلہ درپیش ہو تو اس کے لئے بھی ایسے شخص کے ہاتھ پر جو اس کام کا عزم لے کر اُٹھا ہو، شخصی بیعت ہوگی اور یہ بیعت ''بیعتِ جہاد'' کہلائے گی۔

ماضی قریب میں برعظیم پاک و ہند میں برپا ہونے والی سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ کی عظیم تحریک ''تحریک شہیدین'' کے نام سے موسوم ہوئی، اس لئے کہ اس میں دوسری اہم شخصیت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمتہ اللہ کی شامل تھی۔ ورنہ نہ معلوم کتنے ہزاروں مسلمان اس میں شہید ہوئے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس تحریک کے نتیجے میں اس برعظیم پاک و ہند میں خالصتہً اللہ کے دین کے غلبے کے لئے جہاد و قتال ہوا۔ اس میں سید احمد شہید بریلویؒ نے پہلے بیعت ارشاد لی اور پھر بیعت جہاد ـــ اور اس بیعت جہاد کی وہ آخری منزل بھی آئی کہ سیف بدست میدانِ جنگ میں قتال کیا اور سکھوں کی فوج کے ہاتھوں گردن کٹوا کر بارگاہِ رب العزت میں سرخرو ہوگئے۔

وَلاَ تَقُوْلُوا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ج بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَO
(البقرہ: ۱۵۴)

اس تحریک کا نظم شخصی بیعت پر قائم ہوا تھا، لیکن آج یہ لفظ گالی بن گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو لفظ مرید بھی بدنام ہوگیا اور پھر اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو ان شاء اللہ ترکِ نہیں کریں گے بلکہ ان میں اصل روح پھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔

اب ذرا مزید توجہ کیجئے۔ ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں دینی حلقوں میں یہ تصور عام رہا اور آج بھی ہے کہ اگر کسی کی بیعت کا حلقہ تمہاری گردن میں نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ دین کا صحیح تقاضا پورا نہیں ہو رہا۔ میں کہتا ہوں کہ

اصل حقیقت یہ ہے کہ:

’’اگر بیعت جہاد کے لئے آپ کسی کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں تو دین کے وہ تقاضے اور فرائض، جو میں نے قرآن مجید اور احادیث شریف سے آپ کے سامنے تفصیل سے بیان کئے ہیں وہ پورے نہیں ہوسکتے۔‘‘

البتہ یہ ضرور ہے کہ اب چونکہ نبی نہیں، کوئی معصوم نہیں، لہٰذا آپ کو خود تلاش کرنا پڑے گا کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کی صدا لگا رہا ہو اور ان فرائض کی انجام دہی کے لئے کوشاں ہو اور آگے بڑھ رہا ہو! اور اگر آپ کا دل اس پر مطمئن ہوجائے، اس کے فہم اور اس کے خلوص و اخلاص پر آپ کو اعتماد پیدا ہو تو اس کے ساتھ وابستہ اور منسلک ہوجایئے!...... میں کہا کرتا ہوں کہ اس طرح اگر ہزار قافلے بھی بن جائیں تو کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ منزل ایک ہو۔ اگر دینی فرائض کا تصور صحیح ہو، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بیک وقت کئی قافلے اس تصور کو لے کر رواں دواں ہوجائیں۔ منزل تو سب کی ایک ہی ہوگی۔ میرے نزدیک سب کا ایک ہونا اب لازم نہیں ہے۔ سب کا ایک ہونا صرف رسول کے ساتھ ہونا لازم ہوتا ہے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ ایامِ حج میں جب منیٰ سے وقوفِ عرفات کے لئے سفر ہوتا ہے، تو بیک وقت ہزاروں قافلے چلتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا جھنڈا الگ ہوتا ہے۔ لیکن سب کا رخ کس طرف ہے؟ عرفات کی طرف! منزل تو سب کی ایک ہی ہے۔ چنانچہ اگر ہزاروں قافلے بھی ہوگئے تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر کوئی شریکِ سفر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قافلے والوں میں فرائض دینی کا صحیح اور مکمل تصور ہی مفقود ہے، یا یہ کہ جو راستہ اختیار کیا جا رہا ہے اس کا رخ منزل کی طرف صحیح طور پر نہیں ہے، بلکہ شاہراہ کو چھوڑ کر کوئی Short Cut اختیار کرلیا گیا ہے، جس کی بدولت منزلِ مقصود تک جلد پہنچنے کی بجائے یہ قافلہ اس شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ میں ایسا الجھ کر رہ گیا ہے کہ منزل کو جانے والی اصل شاہراہ سے تعلق ہی منقطع ہوگیا ہے، یا کسی قائد پر دل نہیں ٹھک رہا ہے کہ یہ صحیح شخص نہیں ہے، یا مخلص نہیں ہے، محض دوکاندار ہے تو ایسی صورت میں وہ کسی اور کو تلاش کرے...... یا پھر خود کھڑے ہوکر پکارے کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ، خود قافلہ بنانے کی سعی کرے۔ یہاں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، تمام حقوق کسی کے نام

محفوظ نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا قافلہ نہیں بنا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر نیت صاف ہو، دل میں خلوص ہو، دوسروں سے الجھنے سے اجتناب ہو، سامنے منزل اقامتِ دین کی ہو تو خواہ سینکڑوں قافلے ہوں یا ہزاروں، کوئی مضائقہ نہیں۔ خلوص و اخلاص ہوگا تو وقت آنے پر وہ جڑتے چلے جائیں گے۔ (They will clamp together) اور اگر چلنا ہی نہیں ہے تو تم بھی کھڑے ہو، ہم بھی کھڑے ہیں۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد ___ یہ ہے طرزِ عمل جو ہمارا آج ہے اور بعض لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ نہ چلیں گے نہ چلنے دیں گے، نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے۔ تو ہر طرزِ عمل آپ کو مل جائے گا۔ لیکن جسے بھی چلنا ہے اور اس کی چلنے کی نیت ہے تو وہ کوئی قافلہ تلاش کرے اور جس پر بھی دل مطمئن ہوجائے، اس میں شامل ہوجائے۔ اس کے بعد آنکھیں کھلی رکھے، کان کھلے رکھے، دائیں بائیں دیکھتا رہے، اس سے بہتر قافلہ ملے تو اس کی طرف لبیک کہے۔ آخر دنیوی معاملات میں بھی ہمارا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے نا کہ ’’ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں‘‘ ___ یہ تو نہیں ہوتا کہ آپ کہیں کہ اب میں بساط خانے کی دکان (جنرل سٹور) شروع کرچکا ہوں، کیا کروں؟ اس میں تو منافع نہیں ہے، ہے تو بہت قلیل، اصل میں مجھے فلاں کاروبار کرنا چاہئے تھا۔ بلکہ آپ بساط خانے کے کام کی بساط لپیٹیں گے اور کوئی دوسرا کام شروع کردیں گے۔ یہ ہوتا ہے کہ نہیں؟

حرفِ آخر

حضرات! یہ چھ باتیں میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ ان سے ہمارے سامنے اپنے دینی فرائض کا ایک صحیح اور جامع خاکہ آ گیا ہے، اس کے علاوہ تو ساری تفاصیل ہیں۔ اگر خاکہ نامکمل رہے گا تو آپ کا فرائض دینی کا تصور نامکمل رہے گا، لہٰذا ایک مکمل اور جامع خاکہ سامنے ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل ضرورت قدم بڑھانے کی ہے۔ اگر آپ نے منزل مقصود کے تعین کے ساتھ سفر کا آغاز کردیا تو اگر منزل تک نہ بھی پہنچ سکے تب بھی آپ کامیاب ہیں۔ ہمارے دین کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوگا۔ جو شخص گھر سے ہجرت کی نیت سے مدینہ کے لئے نکلا تو خواہ وہ مدینہ پہنچ سکا یا نہیں پہنچ سکا، وہ مہاجر ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا کہ جو شخص ہجرت کی نیت سے گھر سے نکل آیا اور راستہ ہی میں اسے موت آ گئی تو اس کا اجر اللہ کے

ذمہ ہوگیا:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ(آیت ۱۰۰)

لہٰذا جو آغاز کردے اس کا اجر محفوظ ہے۔ رہا یہ سوال کہ کہاں تک پہنچ پائیں گے، اس کا کوئی پتہ نہیں۔شہیدینؒ کی تحریک اگرچہ دنیوی اعتبار سے ناکام ہوگئی اور وہ خاک وخون میں لوٹ گئے، لیکن وہ اللہ کے ہاں فلاح پائیں گے۔ اگر دنیوی لحاظ سے بھی یہ تحریک کامیاب ہوگئی ہوتی تو پورا برعظم پاک و ہند دارالاسلام بن سکتا تھا۔ ورنہ یہ علاقہ جو پاکستان کہلاتا ہےضرور دارالاسلام بن جاتا۔ شاید آپ کومعلوم نہ ہو کہ اس تحریک کی ناکامی میں اصل ہاتھ کن لوگوں کا تھا؟ سکھوں کی تلواریں اسے ختم نہیں کرسکتی تھیں۔خود اپنوں کی غداری نے اسے ختم کیا تھا۔

ایک بندہ مومن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبہ اُخروی میں کامیابی ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے قرآن حکیم اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہمیں ہمارے دینی فرائض کا ایک مکمل خاکہ ملتا ہے، جو تین جامع ترین اصطلاحات ،عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے حوالے سے ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اس کے لوازم بھی کسی قدر تفصیل سے بیان ہوگئے ہیں جن میں اہم ترین لوازم ، جہاد فی سبیل اللہ،التزام جماعت اور بیعت سمع و طاعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ان دینی فرائض کی بجا آوری کا مصمم ارادہ دلوں میں پیدا کریں اور پھراس ارادے کی تکمیل کے لئے پیش قدمی کریں۔

وَمَا تَوفِیقی اِلَّا باللہ العظیم

اَقول قولِی ھٰذا وَاَسْتَغفِرُ اللّٰہَ لِی ولکم وَلِسَائِرِ المُسلمینَ وَالْمسلمات

وَاٰخِرُ دَعْوانا اَنِ الْحَمْدُ اللہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَOO